افتخار جالب کے چند شعری زاویے

پروفیسر ڈاکٹر سعادت سعید
ڈاکٹر شیر علی چیئرمین شعبہ اُردو، ایسوسی ایٹ پروفیسر، الحمد اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد

Abstract:

Essence of iftikhar Jalib `s poetry emerges from the reality of change which is the base of developing universe and human societies. Iftikhar Jalib mentions in the preface of his book entitled Maakahz that the changing universe produces more reactions and an endless cycle of change begins. This could also be taken as a starting point of the new human perspectives. The poets who face new civilization, educational system and way of life can change their traditional way of thinking. When the insufficient traditional symbols lose their expressiveness during facing aforementioned advanced, variable the necessity for the quest of new expressions takes its way. Iftikhar Jalib and his companions introduced new methods of writing poetry. They are of the opinion that they cannot deviate from their original perceptions in order to maintain the false dignity of language. Their passions according to them do not fit into the traditional symbols and conventional linguistic patterns. That's why they inevitably challenged the so-called linguistic prohibitions. In this article the writers pin point how Iftikhar Jalib adapted the new patters of linguistic constructions.

شعر وادب میں لفظی و معنوی تشکیلات کی اہمیت کا اندازہ اردو تنقید میں ابن رشیق، نظامی عروضی سمر قندی، انشا اللہ خان انشا، شبلی نعمانی اور مولانا الطاف حسین حالی کی شعر شناسیوں سے لگایا جا چکا ہے۔ جتنے بھی بڑے شاعر ہو گزرے ہیں

انہوں نے اپنے اظہار کے لیے حسب مقدور زبان سازی کے عمل سے شغف رکھا ہے۔اس ادراک کے تناظر میں موسیقی، مصوری، مجسمہ سازی، رقص اور دیگر فنون کی معنی آفرینی کے اطوار کا بھی جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ ہر میڈیم کا بڑا آدمی اس کی مروجہ بنت کے سلسلوں سے خود کو الگ کر کے ہی معنی کی نئی آئینہ بندیوں تک رسائی حاصل کرتا ہے۔اس سیاق وسباق میں جن عقدوں، رمزوں، بھول بھلیوں، چکر داریوں، پیچیدگیوں اور الجھنوں سے خالقوں کا سابقہ پڑتا ہے اس کی نشاندہی افتخار جالب کی ایک نظم بعنوان ''ڈیگاس کی پرسپشن کی خوش بو'' میں ہوئی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

میں ادب کی لیبر نتھائین دنیا میں
حافظ شیرازی
نواب میرزا داغ دہلوی، اور
خواجہ دل محمد کی گیتا کے اردو ترجمے کے ذریعے
داخل ہوا
دل کی گیتا
الا یاایہاالساقی ادر کاساًوناولہا
اور اقبال کا شاگردِ داغ ہونا؛
ہمارے کورے بھانڈے میں
ایک کائناتی میوزک گونجتا رہتا
کھلا تو اب بھی نہیں
لیکن گوپیوں، ہوس انگیز نسائی ہیولوں
کسمساتی دیویوں کے مشترک منطقوں میں سانس لیتی
کائنات کی رنگینی روح کے تاروں کو جھنجھناتی
پیش آگاہی کے بغیر
شہوت کی اندھی شعاعیں
بدن کو کھدیڑنے لگتیں

یہ اس کے سونگھنے کا کمال تھا کہ
وہ لمحے بھر میں شیر وشکر ہو جاتی
ہماری کڑکڑاتی ہڈیوں کے گودے کو
سیمیٹتی اور کوندے پر کوندا برساتی
ہمیں چکنا، لجلجا تا کیچڑ بنا ڈالتی
ہانڈیوں، پتیلیوں، دیگچیوں کے تلوں پر
پوچا لگا کر
سوکھنے کے لیے دھوپ میں پھیلا دیتی
کھڑکیاں دروازے کھول دیتی
پوری دنیا تازگی سے مہکنے لگتی
جب تک ہم ہوش میں آتے، وہ
ہاتھ پاؤں دھونے کے ساتھ ساتھ
نہا بھی لیتی
ڈیگاس کو پاگل کرنے والی
اس کے بدن کی خوش بو سے
آنگن تک بھر جاتا(۱)

ایڈ گر ڈیگاس امپریشنزم کی تحریک سے تعلق رکھنے والا فنکار تھا۔ اس کی تاثریت پسندی میں جارحانہ کھلا پن پایا جاتا تھا۔ یہ انداز اس کی گھوڑوں، خواتین کے نہانے اور رقص کے مناظر والی پینٹنگز میں دستیاب ہے۔ اس کی تاثریت میں برہنہ حقیقت نگاری کے تیور نمایاں تھے۔ اس نے اپنے مجسموں میں کلاسیکی بیلے کے رقاصوں کے مختلف پوزوں کو دکھانے میں حقیقت پسندانہ ادراک سے کام لیا۔ اس سلسلے میں وقت یا زماں کی پر اسراریت یا خالی مقامی بھی سامنے آئی۔ اس کے مجسموں میں موجود حرکتوں کے وسیلے سے وقت کا ادراک مضمر تعلقات سمیت سامنے آیا ہے:

ایڈ گر ڈیگاس کی اہمیت کے حوالے سے کہا جاتا ہے اس نے فن کی ''زبان دریافت'' خشوع و خضوع سے کی تھی۔ اس کی تکنیکی اور متاثر کن پیچیدگی قابل ستائش تھی۔ وہ اپنے مجسموں اور تصویروں کی تطہیر و تظہیر پر اپنی غیر معمولی تخلیقی توانائیوں کو صرف کرتا تھا۔

بقول مولانا حالی:

''روما کے مشہور شاعر ورجل کے حال میں لکھا ہے کہ صبح کو اپنے اشعار لکھواتا تھا اور دن بھر ان پر غور کرتا تھا اور ان کو چھانٹتا تھا اور یہ کہا کرتا تھا کہ "ریچھنی بھی اسی طرح اپنے بدصورت بچوں کو چاٹ چاٹ کر خوبصورت بناتی ہے۔''(۲)

ڈیگاس کے ادراک کا مرکزی نقطہ یہ تھا کہ اس میں تاثریت کی تجرید کے ساتھ ساتھ ٹھوس انسان کی موجودگی لازمی تھی۔ یہ انسان مجسموں اور تصویروں کے اندر باہر اور باہر اندر کہیں نہ کہیں موجود ہوتا ہے۔ جانوروں کی خالص شکلوں کی نقشہ کشی اس انداز سے ہوئی ہے کہ اس کے تناظر میں انسان نظرانداز نہیں ہو پایا۔ حافظ شیرازی نے جس ہستی کی شیریں دہنی اور شمشاد قدی کا تذکرہ کیا ہے وہ بڑے بڑے صف شکنوں کا دل توڑنے کا کام کرتی ہے۔ یعنی اگر خدا کا تذکرہ بھی کیا جائے تو انسان غائب نہیں ہو سکتا۔ کہ عشق پہلے پہلے تو آسان لگتا ہے لیکن بعد ازاں بے شمار مشکلیں در پیش ہوتی ہیں۔ تو دیوان حافظ کے ذریعے ادب میں داخل ہونے کا سادہ مطلب یہ ہے کہ ہستی مطلق سے عشق کو بھی کسی طور آسان نہیں جاننا چاہیے۔

الا یا ایہا الساقی ادر کاسا و ناولہا
کہ عشق آسان نمود اول ولی افتاد مشکل ہا(۳)

اے ساقی! شراب کا پیالہ لا اور مجھے پلا، عشق ابتدا میں آسان ہوتا ہے بعد ازاں مشکلیں سامنے آتی ہیں۔

تصوف کے بعد مرزا داغ کی عشقیہ شاعری یعنی بقول اقبال بھری محفل میں اپنے عاشق کو تاڑا۔ دل کی گیتا میں اساطیری دیویوں اور گوپیوں کی ابلتی نسائیت۔ محبوب مجازی، جذباتی ابال میں کھدیڑے جاتے ہیں۔ اس تناظر میں لیوی سٹراس کی کتاب ''سیوج مائنڈ'' یاد آتی ہے۔ ہندوستان میں کوک شاشتری جنورپن سے کون واقف نہیں ہے۔

''افتخار جالب نے اپنے اولین شعری مجموعہ ''ماخذ'' میں اعلان کیا تھا:

''ہم بے جان کائنات کو بدلتے ہیں، خود بھی تبدیل ہوتے ہیں اور بدلی ہوئی بدلتی کائنات سے نباہ کرتے ہیں۔ بے جان کائنات اور بدلتی ہوئی بدلتی کائنات مزید ردِ عمل پیدا کرتی ہے اور تغیر و تبدل کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ انسانی ذات کا نقطہ آغاز یہی ہے۔ یہیں سے اُن چھوٹی چھوٹی حقیقتوں کی ابتدا ہوتی ہے جو بعد میں مزید دریافتوں اور دانائیوں کی راہیں کھولتی ہیں۔ داخلیت اسی حوالے سے متعین ہوتی ہے، اور داخلیت کے ابتدائی مہیجات جو ترتیب پاتے ہیں اس کا سرچشمہ بھی انسان اور کائنات کا ٹکراؤ ہی ہے۔ یہ ابتدائی داخلیت اپنے طور پر مزید نمو پاتی ہے، بڑھتی ہے، پھلتی پھولتی ہے، متخیلہ کے عمل سے، حدیں پھاند لیتی ہے۔ اس کا پھیلاؤ خود کار اور پروٹوپلازمک ہوتا ہے! پورا نظام تلازمات پھیلتا ہے، تاآنکہ ابتدائی داخلیت سے متغیرہ، وسیع اور لامتنہیٰ داخلیت تک کا سفر طے ہو جاتا ہے۔ یوں ہماری ابتدائی داخلیت کا منبع تو انسان اور کائنات کا تصادم ہے، لیکن داغ بیل پڑنے کے بعد یہی داخلیت اپنے طور پر نشو و نما پانے لگتی ہے اور متخیلہ کے عمل سے اس میں اتنی وسعت پیدا ہو جاتی ہے کہ اس کا تعلق خارج سے منقطع ہو جاتا ہے؛ ابتدائی داخلیت کی کایا کلپ ہو جاتی ہے۔ داخلیت کی اس انتہائی شکل اور وسعت سے ہمارا ظرف عہدہ برآ نہیں ہو پاتا۔ تہذیبی علامتیں اور علامتوں کے وسیلے سے مربوط کرنے والا نظام ساتھ چھوڑ دیتا ہے، بھگتی اور دین الٰہی ایسی تحریکیں اور محمد حسین آزاد ایسی شخصیتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ''فلسفہ الٰہیات'' میں زبان ریزہ ریزہ ہو گئی ہے۔ موضوع پر گرفت نہیں؛ جملوں کا آپس میں ربط نہیں؛ خالص بے ترتیبی اور انتشار کا عالم ہے۔ اتنا اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ ایک شخصیت مختلف تہذیبوں کی علامتوں میں پھنسی ہوئی ہے۔ کچھ بنانے، کہنے اور متعین کرنے کی سعیٔ ناتمام ہے۔ سب کچھ ان کا ساتھ چھوڑ چکا ہے: وسیع سے وسیع تر استعارے لڑھکتے ہیں، زُبان قواعد سے روگردان ہو چکی ہے، بات کسی طور نہیں بنتی۔ متغیرہ لامتنہی داخلیت نے ان کا ظرف پارہ پارہ کر دیا ہے اور وہ کربناک گھٹن اور بے بسی کے عالم میں ہیں۔ ان کی بات ہم تک نہیں پہنچتی۔ ہمارے اور ان کے درمیان ایک خلیج حائل ہے۔ زبان ان کی نبوت کی تاب نہیں لاتی اور نبوت کو روزمرہ کی مفاہمت کا یارا نہیں۔ محمد حسین آزاد اور اُن کا عہد کیسے آشوب

سے گذرے: مغلیہ سلطنت گئی،آزادی کی پہلی تحریک مٹی،گھر گھر ماتم ہوا۔ جانے والے اپنے ساتھ ہماری ترتیب، قدریں اور رہن سہن لے گئے۔اپنے پیچھے افسوس، بے خانماں بربادی اور بے قدری چھوڑ گئے۔ وہ گئے، ان کے ساتھ وقت گئے، وقتوں کے ساتھ ایک طرز سے زندگی کرنے کے اصول گئے۔ ہم تنہا اور لاچار ہوئے، سو اب تک ہیں۔بیچ میں لگ بھگ سو برس گذرتے ہیں۔ایک نئی تہذیب، تعلیمی نظام اور طرز معاشرت کی ابتدا ہوتی ہے۔کچھ زخم مندمل ہوتے ہیں، کچھ گھاؤ اور پڑتے ہیں۔افتاں اور خیزاں بٹوارے کے حشر تک آپہنچتے ہیں۔ تہی دامنی پہلے بھی کچھ کم نہ تھی، اب رہا سہا بھی جاتا رہا۔ تشدد، دہشت اور افراتفری نے پہلے سے بھی بڑھ کر رنگ دکھایا۔روائتی علامتیں اپنی تکمیلی حیثیت میں مذکورہ ترقی یافتہ، متغیرہ اور لامتنہیٰ داخلیت کے لیے پہلے ہی ناکافی تھیں، قدریں بکھرنے اور تشدد سہنے کے بعد زُبان بھی شکست وریخت سے دوچار ہوئی۔'(۴)

س تناظر میں ان کے کائناتی موسیقی کے ادراک کو بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔

''ہمارے کورے بھانڈے میں ایک کائناتی میوزک گونجتا رہتا''
کھلا تو اب بھی نہیں
لیکن گوپیوں، ہوس انگیز نسائی ہیولوں
کسمساتی دیویوں کے مشترک منطقوں میں سانس لیتی
کائنات کی رنگینی روح کے تاروں کو جھنجھناتی
پیش آگاہی کے بغیر
شہوت کی اندھی شعاعیں
بدن کو کھدیڑنے لگتیں(۵)

فنکار اپنی لبیڈو کو پس انداز نہیں رکھ سکتے۔ان کے نجی لمحات ان کے فن میں عود عود کر آتے ہیں۔خیر کی تلاش میں ان کا رومانوی ننگا پن کلاسیکل قدروں کا تعاقب کرتا ہے۔وہ زناجبر واکراہ کی کہنہ رسموں کو پوپلے منہ سے الوداع کہتے ہیں مگر ان کی دبی خواہشیں ان کے خوابوں میں فساد مچانے لگتی ہیں۔یعنی خواب میں خیال کو جس محبوب سے سابقہ پڑتا ہے وہ خیالی

ہوتے ہوئے بھی حقیقی ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جب آنکھ کھل جاتی ہے تو صاحب اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے ہیں۔ زیاں اور سود سے ماورا اٹھہرتے ہیں۔ ان کے غیر معمولی مشاہدے بذریعہ بصری تاک جھانک اندھی جنسیت کو ہوا دینے کا کام کرتے رہتے ہیں۔ ڈیگاس کے ادراک کی خوشبو اپنے اندر افسردہ علمیت، مکمل سماجی حقیقت کشی، شعلہ خیزی، معنوی وسعت اور تاثراتی گہرائی سمیٹے ہوئے ہے۔ اس کی باغیانہ نہج نے ریاست کے تھانوں کے کنگروں پر فنکارانہ فلاخن سے حملے کیے۔ نئی نسل کے لیے پرانی تاریخی ثقافت سے گریز کو اہم جانا۔ نئی حقیقتوں کو شعر وادب میں منتقل کرنے کے لیے جہاں لسانی ردو بدل سے سابقہ پڑتا ہے وہاں نئے اسلوبیاتی سانچے بھی تخلیق کیے جاتے ہیں۔ افتخار جالب اور ان کے ہم عصروں نے اپنی تخلیقات میں ان دونوں حوالوں سے نسبت رکھی ہے۔ علاوہ ازیں جنس کے حوالے سے نئے سیاسی اور تہذیبی حقائق کو بھی اپنی نظموں کی بنت کا حصہ بنایا ہے۔

افتخار جالب کے نظریہ شعر کی نشاندہی میں ان کی مذکورہ نظم اہمیت کی حامل نظر آتی ہے۔ ڈیگاس کے ادراک کی خوشبو ان کی ایک اور نظم میں بھی تلاش کی جاسکتی ہے۔ اس کا عنوان ہے ''معنی کا خمیازہ تشدد کا صلہ، واللہ''

یہ کہ صد مرتبہ محتاج ہوئی، چلتی زمیں
بند پیمانہ ثمر چکھنے کو، لذت کے منقش در و دیوار
وہی بات ہے، جو عقد ثریا کی گندھی شاخیں
لرزتے ہوئی پیچیدہ گھنے سائے، تڑپتے ہیں
زباں خشک ہوئی، نطق گلوگیر ہے
پابند ہے، آواز
پابجولاں ہے، شعاعوں میں بندھے سائے
سلاخوں سے گزرتے ہیں
بھنور کرنیں اچٹتی ہوئی نظروں کے حباب آئے نہ پھیلاؤ میں حرکت کا ثبات
چپچپا، خودنگر، احساس کی شرمندہ بصیرت کا امر
ایک تغیر ہی کہیں، گہرے سیہ پانیوں میں کھول گیا
شب کے محجوب گلی کوچوں میں کیچڑ ہے

تعفن سے شرابور سراسیمگی
آرائش محفل میں فسوں پھونکتی
نظروں کی زباں بولتی ہے، لفظ سوارت نہ ہوئے
باندھتے رہنے میں رہیں: معنی کا خمیازہ تشدد کا صلہ، واللہ (۶)

اس نظم میں عمومی نحو سے بہت حد تک گریز کیا گیا ہے۔ معانی کی تلاش میں لفظوں پر جستیں لگانی پڑتی ہیں۔ شاعر کی داخلیت جس بحران کا سامنا کر رہی ہے اس میں عہد نو کے ہاتھوں کہنہ طرز زیست کی شکست وریخت کرنے والی مادی اور تہذیبی صورت حال کا گہرا عمل دخل ہے۔

بصیرت، بصارت، صوت، رنگ، تیشگی، اعضا کی زبانیں بھی بولتی ہیں۔ لفظوں کی کوملتا، دھیمے سر سوار تھ سے جڑے ہیں۔ لیکن معنی میں اگر تشدد نہیں تو وہ اکارت جاتے ہیں۔ لسانی تشکیلات میں پرانی گرامر کے اطوار پر بھرپور حملہ کیا گیا ہے۔ نئی نظم کی لفظیات میں احتیاج، شجر ممنوعہ، لذت انگیزی، ناہید غیرتی یعنی ہرتان ہے دیپک، اس شجر کی شاخوں کے پیچیدہ تڑپتے گھنے سائے، خوفزدگی میں زبان خشکی، نطق کی گلوگیری، پابند آوازیں، شعاعوں میں بندھے پابجولاں سائے، سلاخوں سے گزرتے ہوئے، ''بھنور کرنیں اچٹتی ہوئی نظروں کے حباب، آئینہ پھیلاؤ میں حرکت کا ثبات، پچپچا، خودنگر، احساس کی شرمندہ بصیرت کا امر، ایک تغیر ہی کہیں، گہرے سیہ پانیوں میں کھول گیا'' اس اہانت سے شب کے مجوب گلی کوچوں کا کیچڑ سے بھر جانا، سراسیمگی کا تعفن سے شرابور ہونا، یہ سب کچھ نظم کی آرائش محفل میں فسوں پھونک رہا ہے۔ ساری کیفیتیں ایک وحدت کے صدرنگ روپ ہیں۔ نظم کی اکہری سطحیں نئی شاعری میں ملیامیٹ ہو چکی ہیں۔ خیال کے اندر سے خیال برآمد ہوتا ہے، کیفیت در کیفیت نظم آگے بڑھتی ہے۔ نفسیاتی، بشریاتی، ثقافتی، سیاسی، اخلاقی سلسلے ایک دوسرے میں بھنور کی صورت پیوست ہو جاتے ہیں۔ ان سب کیفیات کو نظم ایک وحدت میں پروتی ہے۔ تو شاعر کا یہ کہنا تو بنتا ہے:

> ''قدیم بنجر پرانے وقتوں کا، جب زمین وزماں کی وحدت تھی: کائناتی شعور زندہ تھا: نوع انسان کا، جب من وتو کے لخت شیرازہ بند ذہنی فشار سے ناشناسا تھی، استعارہ: شدید، بھرپور ہے۔ مگر واپسی نہیں۔ یہیں رہیں: وقت کی حدوں میں: عذاب جھیلیں: جو حوصلہ ہو تو کچھ کریں: توڑ پھوڑ: تعمیر نو: نہیں تو، محض اس کا سوچ لیں: سوچنا ہی کافی ہے: وقت ہر چند کہ مدور نہیں ہے:

شاموں کے بعد صبحیں: بہار کی، روشنی کی: جو لوٹتی نہیں ہے: تو نوحہ خوانی کا فائدہ؟ آگے دیکھو: انسانی قافلہ دم بدم رواں ہے: پلٹتا بڑھتا، فسردہ شاداں: ہزار تکمیل کی تمناؤں سے مزین: مگر وہی ایک نا تمامی! تماتر نا تمامیوں کے باوصف اجتماعی تمام: آگے قدم: سلامت رہیں: یہ مجبوریوں کے مارے ہوئے ارادوں کا، من ہی من میں، چٹکنا، منزل کو دیکھنا!"(۷)

افتخار جالب کی نظمیں اکہرے معانی سے تیار نہیں ہوئیں ان کے اندر "عقدوں، رمزوں، بھول بھلیوں، چکر داریوں، پیچیدگیوں اور الجھنوں" کو عکس فگن دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ کائناتی شعور سے لبریز ہیں، ان کا نوع انسان کی وحدت سے سروکار ہے۔ من و تو کی غزلیہ روایت سے انہیں دور کی نسبت بھی نہیں ہے۔ ان کی بنت میں استعاروں کی بھرپوری اور شدت ہے۔ ان کا مرکز حال ہے۔ یہ ماضی سے منفک ہیں۔ ان کا وقت کے مدور تصور سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ ان میں ہر سطح کی توڑ پھوڑ کی وکالت کی گئی ہے۔ ماضی کی نوحہ خوانی ان کا مدعا نہیں۔ یہ نظمیں آگے دیکھنے والی ہیں۔ ان میں انسانی قافلوں کو دم بدم رواں دکھایا گیا ہے۔ افتخار جالب کی نظموں میں وقت کی کئی کیفیتیں ہیں۔ یہ "پلٹتا بڑھتا، فسردہ شاداں" ہے۔ اس میں نت نئے سلسلے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ تکمیل کی تمنائیں از خود مفقود ہو جاتی ہیں۔ بقول اقبال:

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دما دم صدائے کن فیکوں(۸)

افتخار جالب بھی ناتمامی کی بات کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ وقت کے زیر سایہ پرورش پاتے انسانوں کی اجتماعیت کا سراغ لگانا انسانی زندگی کے معنی متعین کرنے کا باعث ہے۔ انسان نے آگے قدم بڑھانے ہیں۔ وہ انسان کی سلامتی کی بات کرتے ہوئے اس امر کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ انسان کو مجبوریوں کے اندر ہی سے اپنی آزادی تلاش کرنی ہے۔ اس کے من ہی من میں پیدا ہوتے ارادے منزل نمائی کر سکتے ہیں۔ اس حوالے کو تقویت دیتی ان کی یہ نظمیں ملاحظہ ہوں:

چیخ ادھوری عقوبت چھینتی
کبھی سچ مچ دھول کا بادل اٹھتا ہے
کبھی محض گمان گزرتا ہے، پیچیدہ شاخوں سے
چھن چھن آنکھوں کو چھوتا سورج

گدلے معلق ذروں میں لپٹا، دھندلی نظر کا دھوکا
واہمے کی تعبیر سے ملتے جلتے کپڑوں میں اعصاب رگیدتا،
خوف کی شکلیں بناتا ایڈ گر ایلن پو
شرمندہ تشنج، سہا ذائقہ!
جینا بھیانک خوابوں میں ڈھلتا، آخری مرحلے پر
دم گھٹنے کا علم، چیخ ادھوری عقوبت چھینتی
نامعلوم حقیقتیں جال بچھاتی ہیں
کہیے، خیر تو ہے۔۔لاحول ولا! ہمیں شوقیہ فکر کی لذتیں ہیں
جنھیں کلمہ خیر کی خلعتیں چاہئیں، لے لیں؛ لیلائیں: لب
بستہ سر نیہوڑائے، ظلم کی تیغوں کے سائے میں، اونچی رکھیں لو
یہ بھی خوب رہی مینڈے رانجھناں وو، مینڈے رانجھناں وو،
مینڈے رانجھناں وو! (۹)

وقنا ربنا عذاب النار
صدر محترم، شعر کا وظیفہ وفا شعاری ہے، حاکموں کی خدمت ہے
رزق سے کون کھیل سکتا ہے؟ بھوکوں مرنا، عقیدہ رکھنا، ہمارے بس میں نہیں ہے
خدمت گزار بندے ہیں، آپ جانیں، ہماری خدمت کی کوئی وقعت نہیں ہے
خدمت کے دام لیتے ہیں۔ جانتے ہیں، حساب بیباق کرنے والے
ہماری مجبوری جانتے ہیں
سنا ہے، اب کے برس غریب الدیار شاعر نے بات کہہ دی
عظیم شاعر کے روبرو، صدر محترم، آپ تک بھی پہنچی
ممکن ہے، واہگے تک ہی گئی ہو، ہر بات کی حدیں ہیں
یہ کیا ضروری کہ آپ تک لامحالہ پہنچے! مگر یہ واہگے کا ذکر کیسا؟ جواز کوئی نہیں ہے

ممکن ہے یاد ہو، صدر محترم، ٹوبہ ٹیک سنگھ : آدمی کا قصہ ہے، منٹو صاحب نے خوب لکھا ہے
جو اطاعت گزار ہو جائے، اس کی خوش بوئے آدمیت تباہ و برباد
بھنبھناہٹ سے کام چلتا ہے۔ مجال کیا جو درون آدم کا نعرہ احتجاج برپا ہو
رزق کھانے کے بعد ہر لمحے مرگ جرات کا ذائقہ : ترش، تلخ، شیریں مقال
راوی نے کہہ دیا ہے : تمام چہروں کے مسخ ہونے کا وقت آپہنچا
الیعذر کا چمکتا چہرہ بگڑ گیا ہے، کریہ خنزیر لگ رہا ہے
خدا گواہ، صدر محترم، آپ کی شباہت بدل رہی ہے
ہمیں خرابے میں چھوڑے جاتے ہو، ہائے ربا!
ابھی خرابہ تو نامکمل ہے : گاہے گاہے غریب شاعر کی باولی چیخ سنسناتی ہے
درون آدم کی راستی احتجاج کرتی ہے
ہمیں نہیں چاہیے، خدارا، ہمیں نہیں چاہیے
ہمیں مکمل سکوت دے دو
ہمیں جہنم کی سختیوں سے رہائی بخشو
مہیب سناٹا، تیرہ محبس خرابہ دے دو، غریب شاعر کو ساتھ لے جاؤ
شکریہ، صدر محترم، شعر کا وظیفہ وفاشعاری ہے، حاکموں کی خدمت ہے (۱۰)

افتخار جالب نے غیر معمولی انداز کی نظمیں لکھی ہیں۔ ان کے کلام کی تفہیم کی جانب نقاد اور شارح توجہ دے رہے ہیں۔ ان کو اپنی زندگی میں اپنی تفہیم نہ ہونے کا شکوہ بھی رہا ہے۔ یعنی "نہ سہی گر مرے اشعار میں معانی نہ سہی" تاہم انہوں نے اپنے مستحکم ارادوں سے اکہری اور یک سطحی نظمیں لکھنے والے نظم نگاروں کو ادب کے رنگ سے باہر کرنے کی مساعی کی۔

افتخار جالب نے اپنے شعری مجموعے مآخذ کے تیسرے حصے کا آغاز یوں کیا ہے:

The imperfect is our paradise.

Note that, in this bitterness, delight,

Since the imperfect is so hot in us,

Lies in flawed words and stubborn sounds.

Wallace Stevens(۱۱)

والس سٹیونز فردوس کو ناتمام کہتے ہوئے شاعر کے ادھورے الفاظ اور سرکش اصوات میں اس کے باطن کی گرم رو تلخی اور سرخوشی کو منعکس پاتا ہے۔ افتخار جالب بھی کسی شے کو مکمل نہیں سمجھتے۔ تاریخ اشیا، سماج اور انسان کو مستقل تبدیل کرتی رہتی ہے۔ شاعروں کی شاعری میں جھلکتی علامتوں کے سرچشمے ان کے گہرے تصورات اور عمیق افکار ہوا کرتے ہیں۔ افتخار جالب کی نظموں میں سر کھینچتے آہنگ، ان کے باطن میں موجود موسیقیت کے عکاس بھی ہیں۔ انہوں نے آزاد نظم کے اندر جن نئی ہیئتی تبدیلیوں کو سمویا ہے وہ ان سرکش آوازوں ہی کا نتیجہ ہیں جو ان کے باطن میں نمودار ہوتی رہی ہیں۔ اس اعتبار سے ان کی شاعرانہ معنویت اور مفاہیم کی شناخت کے لیے ان کے اندر کی شوریدگی سے بھی ربط رکھنا لازمی ہے۔ یہاں افتخار جالب کے تنقیدی مضامین سے چند حوالے دیئے جارہے ہیں تاکہ ان کی شاعری کی تفہیم میں آسانی پیدا ہو سکے۔

> ''ہمارے یہاں رومانوی ادب کو رقت انگیز ادب قرار دیا جاسکتا ہے۔ اسی رقت انگیزی کی ایک شکل ضیا جالندھری کی شاعری ہے، جسے ان کے دوست احباب گہری مایوسی کا نام دیتے ہیں۔ گہری مایوسی کے وسیلے سے انہوں نے کون سا ایسا تیر مارا ہے جس پر اتنی بغلیں بجائی جارہی ہیں۔ جن لوگوں نے وزیر آغا کی 'میں اور تو' ایسی حسابی نظمیں پڑھی ہیں۔ ان کے سامنے کتنے ہی لہو کے چراغ جلائے جائیں، بگڑی ہوئی گھٹیا اختر شیرانیت کا منڈلاتا ہوا سایہ غائب نہیں ہوتا۔ یہ قباحتیں جن کا منبع جذباتیت، ناپختگی اور تن آسانی ہے، آج کل مقبول رجحان ہیں''(۱۲)

اپنے مضمون ''بورژوا فی بورژوازی'' اشاعت شب خون شمارہ ۱۳ میں وہ لکھتے ہیں:

> ''ادب میں کیوبزم کے یہ متوازی سلسلے دیکھنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ غیر معروضیت ہمارے ویلٹنشانگ (Waltenschung) کے خمیر میں ہے۔''(۱۳)

> ''زبان زمانی صفات رکھتی ہے۔ ایک جملے کے بعد دوسرا جملہ آتا ہے۔ کلام کے تمام اجزا، جملے، بیک وقت موجود نہیں ہوتے، بتدریج بنتے مٹتے ہیں۔''(۱۴)

شعور کی رو کے ادب کے حوالے سے افتخار جالب کا کہنا تھا:

''اس ادب کی ہیئتی ساخت پرداخت بڑی شدت سے اپنے کل کی اکائی کو متحجر کرتی ہے تاکہ استعارہ اپنے زمان و مکان کی حد بندی کو توڑ کر غیر معروضیت کا اثبات کرتے ہوئے تجرید سے ہم کنار ہو جائے۔''(۱۵)

افتخار جالب اپنے مضمون ''اقطار السّماوات والارض کو پھلانگتے معانی کی ریزش'' میں رقم طراز ہیں:

''شعر و ادب میں معنی کا تصور منطقی قضیوں سے تعرض نہیں کرتا، بلکہ ان کی بجائے ہر وہ وسیلہ اختیار کرتا ہے جس سے مربوط نثری جملے ایسے مفہوم مرتب نہ ہوں۔ کیا ہم شعر و ادب کے نثری مفہوم کے بجائے اس تصور سے آشنائی پیدا نہ کریں جو، بقول سوسین لینگر، امپورٹ کا درجہ رکھتا ہے۔ یاد رہے شعر و ادب منطقی معنوں کے برعکس تاثر کی اس اکائی کے متحمل ہوتے ہیں جو بدیں وجہ علامتی حیثیت رکھتی ہے کہ اس کی بدولت ہم ایک مخصوص تجرید سے آگاہ ہوتے ہیں۔''(۱۶)

افتخار جالب لکھتے ہیں:

'' لسانی تشکیلات زبان کے تمام ذرائع سے فرداً فرداً تعرض کرکے انہیں آج کل کے سطحی اور اکہرے لسانی تار و پود میں ضم کرنے کا وسیلہ بھی ہیں۔ لسانی تشکیلات کے یہ دونوں وظیفے ذہنی و جذباتی آفاق کی ہم آہنگی پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ نئی دریافتوں کے سلسلے میں ژرف بینی کی تحصیل میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔''(۱۷)

''لسانی تشکیلات بحران کو پیدا کرنے والے موضوع اور صیغۂ اظہار کی دو ٹوک تقسیم کو رد کرتی ہیں کہ لسانی تشکیلات نہ موضوع ہے نہ صیغۂ اظہار، بلکہ ان پر حاوی اور ان سے ماورا وہ کلی صداقت ہیں جن کے حصے بخرے نہیں کیے جا سکتے۔''(۱۸)

افتخار جالب نے اپنی ایک نظم میں فیض صاحب کے حوالے سے یوں اظہار خیال کیا ہے:

فیض صاحب جب لینن پیس پرائز لے کر لوٹے
تو گورنمنٹ کالج لاہور میں ایک جشن برپا ہوا

فیض صاحب نے پوچھا: بھائی ایلیا اہرن برگ روسی ادب کا
سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے؟
ایلیا اہرن برگ نے کہا: ایلیا اہرن برگ!
پھر فیض صاحب بہت ہی ہلکے سروں میں ہنسے
سامعین نے قہقہوں کی مارٹر توپوں کے دہانے کھول دیے
جب توپوں کی دغ دغ دغا دغ بند ہوئی
تو فیض صاحب نے کہا: بڑے موضوعات تو
مشرق کے پاس ہیں
مغرب نے میگا ہیئتوں کے انبار لگا دیئے ہیں
موضوع کوئی نہیں
اب مغربی میگا ہیئتوں
اور مشرقی میکرو موضوعات کے
تال میل سے معرکہ آرائی کام ہو سکتا ہے
میں نے یہ سوال
اینٹی ناول کے سیمینار کے موقع پر بھی
اٹھایا تھا
عزیزالدین احمد نے میرے کان میں کہا: وہاں کی ہیئت
یہاں کا موضوع۔۔۔۔ یہ کام مکینیکل ذریعے سے
نہیں ہو سکتا۔ ذرا صبر کریں
______ یہ مٹی بڑی زرخیز ہے، ساقی!
پاک بھارت ملٹر سٹک اسٹینڈ آف عین درمیان میں
ایک ''تھا'' لکھنے کا وقت ہے

______ کون ہوتا ہے، حریف مئے مرد افگنِ عشق! (۱۹)

اس نظم میں سادگی اور پرکاری کا نیا انداز سامنے آیا ہے۔ افتخار جالب نے نظم کے ذریعے معاصر پاکستانی سیاسی و تہذیبی موضوع پر اس کے ارتکازی نکتوں کی روشنی میں تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے موضوع کو مشرق و مغرب کے تضاد اور'' پاک بھارت ملٹرسٹک اسٹینڈ آف کے عین درمیان میں'' امن کا روسی انعام قبول کرنے کا معاملہ بھی زیر بحث آیا ہے۔ سو ایک ہی تخلیق میں ادب، سیاست، متضاد نقطہ ہائے نظر، ایلیا اہرن برگ کی انقلابیت، فیض احمد فیض کی ترقی پسندی ایک نئے موضوعاتی کل کی صورت سامنے لائی گئی ہے۔ اس زمانے میں چین دوست دانشور روسی سیاست کو ترمیم پسندی سے تعبیر کرتے تھے۔ روس بھارت گٹھ جوڑ بھی پاکستان کے محب وطن دانشوروں کو کھلتا تھا۔ علاوہ ازیں پاکستان میں مشرق کے موضوعات پر مغرب کے موضوعات کو ترجیح دینے کی مستحکم روایت بھی موجود تھی۔ ایسے میں مشرق و مغرب کی دانش کے اتحاد کی بات بھی معنی خیز تھی۔ افتخار جالب نے اپنے تنقیدی مضامین کے ساتھ ساتھ اپنی نظموں میں بھی عصری پاکستانی دانش کا جدلیاتی جائزہ لیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کا شعری مجموعہ ''یہی ہے میرا لحن'' نئے قاری کو دعوت مطالعہ دے رہا ہے۔ اس میں نظم نویسی کا بظاہر سادہ لسانی تشکیلاتی انداز نمایاں ہوا ہے لیکن شاعر کے نظری اور نظریاتی اعماق جابجا بکھرے نظر آتے ہیں۔

افتخار جالب کو اس امر کا احساس تھا کہ بیسویں صدی کے نصف دوم میں رومانویت اور ترقی پسندی کی تقلید ضرورت سے زیادہ ہو رہی ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین پہلی سطح پر ان کی اپنی شاعری کے متعدد پہلوؤں کو سامنے لاتے ہیں۔ یار لوگوں نے انہیں ہیئت پرست اور لسانی تشکیل زدہ قرار دینے کی اس لیے کوشش کی کہ وہ ان کے انسان سے متعلق نظریات سے خوفزدہ ہو گئے تھے۔ نئی شاعری کی تحریک برصغیر پاک و ہند کی وہ بڑی تحریک ہے کہ جس کی بدولت اردو شاعری میں اظہار و بیان کے وہ طریقے رائج ہوئے کہ جن سے معاصر شاعر بڑے پیمانے پر مستفیض ہو رہے ہیں۔ نئی شاعری کے ابتدائی دور میں افتخار جالب نے اپنا موقف یوں بیان کیا تھا:

> ''نئی شاعری کا خواب کثرت تعبیر سے پریشان ہونے کو ہے۔ اس سے اگر آپ کو گمان گزرے کہ ہمیں کثرت تعبیر سے کوئی پریشانی لاحق ہے، تو یہ محض آپ کی انتہائی ذاتی غلط فہمی ہو گی۔ حاشا و کلّا ہمیں کوئی تشویش نہیں کہ ہم کسی متفقہ فارمولے کے تحت نہیں لکھتے۔ وہ جو پہلے سے طے شدہ فارمولے کے مطابق ادب کی تخلیق کا بوجھ اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھائے

پھرتے ہیں، انہیں کثرت تعبیر سے وحشت ہو تو ہو، ہمیں نہیں۔ ہمیں تو مختلف بلکہ متضاد آوازوں میں تخلیق کی صداقت کا جواز ملتا ہے۔ ایک فنکار کی متنوع شخصیت اور جہان معنی کو ایک ہی فارمولے کے مطابق جانچنا، ایک ہی سطح کو ہمیشہ دریافت کرنا اور عمومی تشریح کے سہارے نفسیات یا سوشیالوجی میں تبدیل کرنا ہماری نظر میں ایک بے وقعت عمل ہے۔ ادب کی تخلیق میں تضادات کا خاتمہ بالخیر کرنا نثر نویسوں کا شیوہ ہے۔ تخلیقی فن کار کا بنیادی ڈیزائن ہر جہت پھیلی متنوع زندگی کا وہ امیج ہے جہاں ہر نوعیت کے محرکات و مہیّجات اپنے تضاد سمیت موجود ہیں۔ زندگی کا یہ امیج کسی ایک نقطۂ نظر سے نہ تو گرفت میں لیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کا محاسبہ کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ تخلیق کا وہ ڈیزائن کہ جس کا اساسی امیج فی نفسہٖ زندگی ہو، متحارب عناصر کو لیے ہوئے ہوگا،۔۔۔ متحارب عناصر کسی ایک فارمولے کی لاٹھی سے ہانکے نہیں جا سکتے۔'' نتیجتاً'' کثرت تعبیر کی صورت پیدا ہوتی ہے جو خوش آئند ہے کہ زندگی کے امیج سے قریب ترین مماثلت سے نمو پاتی ہے۔''(۲۰)

مذکورہ بالا اقتباسات افتخار جالب کے نقطہ نظر کی تفہیم کے لیے ضروری تھے۔

افتخار جالب کی نظمیں زندگی اور انسان سے ان کی وابستگی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ وہ تعبیر کی تعبیر، معانی کے معانی، نو تاریخیت، نسائیت، ادبی اصناف میں معنوی وحدت کے مسائل پر جا بجا اظہار خیال کر چکے ہیں۔ فرائڈ، یونگ، سوسن سونتاگ، میلکم میگریج، سوسن کے لینگر، ژاک ڈریڈا، ورجینیا وولف، جیمز جوائس، ولیم فوکنر کے نظریات پر ان کی گہری نظر تھی۔ ان کی شاعری کو سمجھنے کے لیے ان کی کتاب 'لسانی تشکیلات اور قدیم بنجر' قارئین کی مدد گار ہو سکتی ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ افتخار جالب، یہی ہے میر الحن، کراچی، فرہنگ، ۲۰۰۴ء، ص ۴۷

۲۔ الطاف حسین حالی، مقدمہ شعر و شاعری، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۷۷ء، ص ۱۵۸

۳۔ حافظ شیرازی، دیوان، دہلی، سب رنگ کتاب گھر، ۱۹۷۲ء، ص ۲۹

۴۔ افتخار جالب، ماخذ، لاہور، لاہور، مکتبہ ادب جدید، ۱۹۶۳ء، ص ۱۱۔ ۱۲

۵۔افتخار جالب، یہی ہے میر الحن، کراچی، فرہنگ، ۲۰۰۴ء، ص ۴۷
۶۔افتخار جالب، یہی ہے میر الحن، کراچی، فرہنگ، ۲۰۰۴ء، ص۷۹
۷۔افتخار جالب، یہی ہے میر الحن، کراچی، فرہنگ، ۲۰۰۴ء، ص۱۰۹
۸۔علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال، بال جبریل، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۰۴ء ص، ۳۶۴
۹۔افتخار جالب، یہی ہے میر الحن، کراچی، فرہنگ، ۲۰۰۴ء، ص ۸۰
۱۰۔افتخار جالب، یہی ہے میر الحن، کراچی، فرہنگ، ۲۰۰۴ء، ص۹۶
۱۱۔افتخار جالب، ماخذ، لاہور، لاہور، مکتبہ ادب جدید، ۱۹۶۳ء، ص ۱۱۱
۱۲۔افتخار جالب، مضمون، ''فرق ہماری آنکھ کا''، اشاعت، ماہنامہ ادب لطیف، دسمبر۔ ۱۹۶۲ء
۱۳۔ایضاً، مضمون ''بورژوائی بورژوازی''اشاعت شب خون شمارہ ۱۳ دسمبر ۱۹۶۸ء
۱۴۔ایضاً
۱۵۔ایضاً
۱۶۔ایضاً
۱۷۔افتخار جالب، لسانی تشکیلات اور قدیم بنجر، فرہنگ، ص ۱۵
۱۸۔ایضاً، ص۱۷
۱۹۔افتخار جالب، یہی ہے میر الحن، نظم ''تھا''، فرہنگ، کراچی، ۲۰۰۴ء، ص۵۷
۲۰۔ نئی شاعری، زبان کا نیا اسلوب، ہفت روزہ قندیل، ۸جولائی ۱۹۶۵ء